آٹھواں باب

کشمیر پر حملہ

قیام پاکستان سے تھوڑا پہلے مسٹر گاندھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو نے ایک سازش کے ذریعے مسلم اکثریتی ریاست جموں و کشمیر کے مہاراجہ کو قائل کر لیا کہ وہ پاکستان کے ساتھ الحاق نہ کرے۔ اسی طرح انہوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھی قائل کر لیا کہ وہ ریڈ کلف ایوارڈ کو تبدیل کرتے ہوئے کچھ اور علاقوں کے ساتھ ساتھ ضلع گورداسپور ہندوستان کے ساتھ شامل کر دے تاکہ وادی کشمیر کے ساتھ خشکی کے راستے ہندوستان کا ملاپ ہو سکے۔

مہاراجہ کی ریاست کشمیر میں بھاری مسلم اکثریت آباد تھی اور پاکستان سے متصل تھی لیکن وہ اڑ گیا اور پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے سے انکار کر دیا حالانکہ کشمیر کے تمام بڑے راستوں کا گزر پاکستان سے ہی تھا۔ کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان ریاستوں کے بارے میں جو انڈرسٹینڈنگ تھی کہ مسلم اکثریتی آبادی کی ریاستیں جو پاکستان میں تھیں یا متصل تھیں پاکستان کے ساتھ اور ہندو اکثریتی ریاستیں ہندوستان کے ساتھ الحاق کریں گی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کشمیر کا الحاق سازش کے ذریعے پاکستان کی بجائے ہندوستان سے کر دیا۔

ایک تیسری نسل کے کشمیری پنڈت جواہر لعل نہرو نے ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک کشمیر کو متنازع بنا دیا۔ وہ جب تک زندہ رہا اس کوشش میں لگا رہا کہ مختلف ہتھکنڈوں سے کشمیر کو ہندوستان کا حصہ بنا سکے۔ اس نے سیکورٹی کونسل کی قرارداد بھی قبول کی جس میں کشمیر کا فیصلہ

ریفرنڈم کے ذریعے ہونا تھا۔ وہ اس ریفرنڈم کو حیلوں بہانوں سے ٹالتا رہا۔ اقوام متحدہ میں حلفیہ یقین دہانی کے باوجود رائے شماری کرانے کے فیصلے پر عمل در آمد کرنے سے منکر ہو گیا۔ ہم نے مہاراجہ اور ہندوستان کی بدنیتی کو بھانپتے ہوئے کشمیر میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ مجھے کشمیر آپریشن کا نگران مقرر کیا گیا۔ میں نے بریگیڈیئر شیر خان اور بریگیڈیر اکبر خان کی شمولیت کا مطالبہ کیا۔ ہر دو کا تعلق ۱۳/۶ فرنٹیر فورس (پفرز) سے تھا۔ ہم نے یہ بھی درخواست کی ہمیں وہ دیسی ساخت کی بندوقیں جو قلعہ لاہور میں پڑی ہیں دے دی جائیں علاوہ اس کے ہم نے سابق آئی این اے کے جنرل کیانی کرنل دارا اور تاج خانزادہ کو بھی اس مہم میں شامل کر لیا۔

تاج خانزادہ کو مظفر آباد محاذ کا کمانڈر مقرر کیا گیا جبکہ جنرل کیانی کو کٹھوعہ روڈ کاٹنے کے فرائض سونپے گئے تاکہ اکھنور پر قبضہ کر کے کشمیر کے ساتھ ہندوستان کا خشکی کا راستہ کاٹ دیا جائے۔

ایسے وقت غلام محمد وزیر خزانہ پاکستان اپنے ایک رشتہ دار میجر خورشید انور کو جو ریلوے بٹالین کا ایک ریزرو آفیسر تھے، جس نے شمال مغربی سرحدی صوبے میں ریفرنڈم کے دوران مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے کمانڈر کی حیثیت سے آنکھ مچولی کھیلی تھی کی سفارش کو کہ اسے بھی ہائی کمانڈ میں شامل کیا جائے۔ اس کی قابلیت فقط اتنی تھی کہ وہ اور مسٹر غلام محمد ہر دو ککے زئی تھے۔ میں نے اس سفارش کی اس بنا پر ٹھکرا دیا کہ میں کسی غیر فوجی شخص کو فوج کی کمانڈ نہیں دے سکتا۔ لیکن غلام محمد اور لیاقت علی خان نے اصرار کیا کہ اسے اور اس کی نیشنل گارڈ کو خوش رکھنے کے لئے اس کی شمولیت بحیثیت راستوں کے حفاظتی دستوں کے طور پر کر لوں۔ چنانچہ میں نے اسے اس کے نیشنل گارڈز اور سے رابطہ قائم رکھنے کے سلسلے پر لگا دیا۔ لیکن پابندی یہ لگائی کہ وہ صرف اپنے نیشنل گارڈز سے ربط ضبط اور تعلق واسطہ رکھے۔ اس لئے کہ مجھے خدشہ تھا کہ وہ کہیں اپنے جوش میں دوسرے غیر متعلقہ افراد کو اس آپریشن میں شامل نہ کر دے۔ دوسری پابندی یہ لگائی کہ وہ سرحد کے قبائلیوں کو بھرتی کرے نہ اور فوج کے کسی بھی ذریعہ سے اسلحہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس نے ہر دو پابندیوں کی خلاف ورزی کی جس کی بنا پر ہماری کامیابی خطرے میں پڑ گئی۔ پھر مجھے کہا گیا کہ میں اس کے لئے چالیس ہزار کا بجٹ فراہم کروں۔ یہ رقم اس نے قبائلیوں کو محسود علاقہ سے مہمند علاقہ تک لانے لے جانے پر ناجائز طور پر ضائع کر دی۔ ہمارا پروگرام تھا کہ ہم کشمیر پر بیک وقت دو طرفہ حملہ کریں گے ایک طرف کھٹوعہ روڈ کو کاٹنا اور دوسری طرف مظفر آباد کے راستے آگے بڑھنا تھا اس مقصد کے حصول کے لئے ہم نے سوات کے سیاہ پہاڑوں کے باسی قبائلیوں کو کشمیر کی سرحدی پہاڑیوں کو عبور کرنے کے لئے منتخب کر رکھا تھا۔ ہمارا یہ بھی فیصلہ تھا کہ دوسرے علاقوں کے

قبائلیوں کو اس جنگ سے دور رکھا جائے تاکہ اچانک حملہ اور رازداری دونوں برقرار رکھی جا سکیں۔

ہمیں اپنے ہیڈکوارٹر راولپنڈی سے اچانک اطلاع ملی کہ خورشید انور میرے احکامات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وزیرستان کے محسود قبائل کو بلا چکا ہے۔ اس نے ان قبائل کو جہاد میں شمولیت پر آمادہ کر لیا تھا۔ یہ چیز ہمارے احکامات کی کھلی خلاف ورزی تھی۔ ہمارے دوسرے حکم کی خلاف ورزی اس نے یوں کی کہ وہ نوشہرہ میں بریگیڈیئر افتخار کے پاس گیا اور اس سے کشمیر کی جنگ کے لئے مشین گنیں طلب کیں جو وہ قبائلیوں کو دینا چاہتا تھا۔ بریگیڈیئر افتخار نے یہ مطالبہ کمانڈر ان چیف پاکستان آرمی تک پہنچا دیا۔ کمانڈر انچیف نے یہ معاملہ سر کلاڈ سے آکن لک جو انڈیا اور پاکستان کا جوائنٹ کمانڈر تھا تک پہنچا دیا۔ گورنر کن انگھم جو اس اپریشن سے لاعلم تھا۔ اسے اچانک قبائلی علاقہ کے پولیٹیکل ایجنٹ کی وساطت سے اطلاع مل گئی کہ قبائلیوں کو کشمیر کی جنگ میں استعمال کیا جارہا ہے اس نے یہ خبر ماؤنٹ بیٹن تک پہنچا دی۔

اس طرح ہمارا جائے معینہ پر پہنچ کر اچانک للکار کا منصوبہ جو اس پلان کی روح تھا اس شخص کی ناسمجھی کی بنا پر تباہ ہو گیا۔ پھر ہم نے ڈی ڈے کے طور پر ستمبر کا ایک دن مقرر کیا تھا۔ پتہ چلا کہ خورشید انور غائب ہو گیا ہے۔ اس نے پشاور میں ایک مسلم لیگی کارکن خاتون سے شادی رچالی اور ہنی مون منانے کہیں غائب ہو گیا۔ حملے میں ایک بار پھر تاخیر ہو گئی۔ ہندوستان نے اس دوران اپنی فوجیں ماؤنٹ بیٹن کی کمان میں سرینگر بھیجنا شروع کر دیں۔ اور عیاری سے کشمیر کے ہندو مہاراجہ کے ساتھ الحاق کا معاہدہ کر لیا۔ تاہم ہمارے حملے کے سامنے کشمیر آرمی نہ ٹھہر سکی۔ ہمارے احکامات یہ تھے کہ خورشید بڑی سڑک سے دور دور رہے۔ تاریکی میں آگے بڑھے تاکہ ہوائی حملہ سے بچاؤ ہو سکے۔ ایک بار اس نے پھر ان احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دن کی روشنی میں ٹرکوں اور لاریوں کے ذریعے بارہ مولا پہنچنے کی کوشش کی۔ دوسری جانب جنرل کیانی کٹھوعہ کی سمت کافی آگے بڑھ گیا۔ مہاراجہ کی فوج ہمارے دباؤ کا مقابلہ نہ کر سکی اور دونوں محاذوں پر پیچھے ہٹتی گئی۔ اسی دوران ہندوستان نے ایک بٹالین فوج سری نگر کے ہوائی اڈہ پر اتار دی گئی۔

میں مظفر آباد بارڈر پر پہنچا۔ جہاں سے آگے جانے کی مجھے اجازت نہ تھی۔ میرے لئے واضح ہدایات تھیں کہ میں محاذ جنگ سے دور رہوں مبادا کوئی پاکستانی وزیر کشمیر میں گرفتار نہ ہو جائے اور یہ جنگ ایک عوامی بغاوت کی صورت میں ہی رہنی چاہئے۔

میں نے قلعہ لاہور سے چالیس ہزار رائفلیں حاصل کیں جو دیسی ساخت کی تھیں۔ یہ

رائفلیں دوسری جنگ عظیم کے دوران جمع کی گئی تھیں۔ یہ رائفلیں میں نے جنرل کیانی کو بھیج دیں۔ ایمونیشن کے لئے مجھے دو سیٹوں والے ایک تربیتی ایئر کرافٹ میں کراچی جانا پڑا جسے ایک نوجوان پائلٹ عبداللہ چلا رہا تھا۔ مجھے اطلاع ملی تھی کہ انگریز ملک چھوڑنے سے پہلے تمام ایمونیشن ضائع کر دینے کا حکم دے گئے تھے۔ انہوں نے حکم دے دیا تھا کہ کئی ٹن وزنی یہ چھوٹا ایمونیشن سمندر میں پھینک دیا جائے۔ میں نے فوری طور پر قائداعظم سے مقامی کمانڈر کے لئے احکامات حاصل کیے کہ یہ ایمونیشن سمندر میں نہ پھینکا جائے یا کسی دوسرے طریقے سے ضائع نہ کیا جائے۔ چنانچہ وہ ریلوے ویگنیں جو ایمونیشن کو ضائع کرنے لے گئی تھیں واپس بلوائی گئیں۔ یہ ایمونیشن میں نے دونوں محاذوں پر تقسیم کیا اور دوسری جانب ہم نے ہندوستان سے کشمیر کو جانے والی خوراک اور پٹرول کو روک لیا۔

تاج خانزادہ، خورشید انور اور ان کے قبائلیوں نے مظفر آباد سیکٹر میں اچھی کارکردگی دکھائی۔ لیکن وہ بارہ مولا پہنچ کر رک گئے۔ جہاں قبائلیوں نے خورشید انور کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کے مابین جھگڑا ایک معمولی بات پر ہوا، یہ کہ کشمیر کے خزانے سے برآمد شدہ تین لاکھ کی رقم خورشید کے خیال کے مطابق حکومت پاکستان کی ملکیت تھی جبکہ قبائلی اسے مجاہدین کی ملکیت تصور کرتے تھے۔ قبائلی اس بات پر بھی اڑ گئے کہ وہ عیدالاضحیٰ منانے کے بعد آگے بڑھیں گے۔ تین دنوں تک انہوں نے بحث جاری رکھی حرکت نہ کی۔ اس دوران انہوں نے مقامیوں میں لوٹ مار شروع کر دی بارہ مولا کانونٹ کی راہب عورتوں کے لاکٹ اور بندے اتار ئے۔ آخر کار بعد از بسیار تاخیر قائم مقام لیزان افسر شیر دل ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کی بے پناہ وعظ و نصیحت کے بعد وہ آگے بڑھے۔ ہندوستان کی ایک بٹالین گیارہویں سکھ رجمنٹ پہلے ہی سرینگر میں موجود تھی جس پر حملہ کر کے ان لوگوں نے اسے پیچھے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا لیکن بجائے اس کے کہ آگے بڑھ کر سرینگر کے ہوائی اڈہ کو قبضہ میں لے لیتے ان قبائلیوں نے بازاروں میں لوٹ مار شروع کر دی اور اس طرح انتہائی قیمتی وقت ضائع کر دیا۔ اسی دوران ہندوستان کی مزید کمک سرینگر کے ہوائی اڈے پر اتر گئی۔ اگر وہ ہوائی اڈے کو بائی پاس کرنے کی بجائے اس پر قبضہ برقرار رکھتے تو مزید کمک نہ پہنچ پاتی۔ ہم نے کشمیر اپنی حماقتوں اور اناڑی پن سے کھویا۔ وہاں کے لوگ پاکستانیوں کی آمد پر خوشیاں منا رہے تھے لیکن قبائل بدنظمی اور بے ترتیبی کا شکار ہو گئے۔

کشمیر پر جب یہ حملہ ہوا ان دنوں لیاقت علی خان لاہور آئے۔ لیکن بیمار ہو گئے۔ انہی دنوں نہرو نے لیاقت علی خان کو پیغام بھیجا کہ اسے اور ماؤنٹ بیٹن کو لاہور میں ملنے کی رضامندی دے دی۔ لیکن آخری وقت پر نہرو زکام کے بہانے نہ آسکے اور ماؤنٹ بیٹن اکیلے آئے۔ میں اپنے

ساتھی چار وزراء اور گورنر کے ہمراہ اس ڈنر میں موجود تھا جس کے اختتام پر ماؤنٹ بیٹن نے لیاقت علی خان سے کہا:۔

"مجھے افسوس ہے نہرو بوجہ خرابی صحت نہ آسکے۔ لیکن پٹیل جو حکومت ہندوستان کا مرد آہن ہے اس نے آپ کو پیغام بھیجا ہے کہ کھیل کے ان اصولوں کے مطابق جو ہم نے ہندوستان کی تقسیم کے سلسلے میں اپنائے ہوئے ہیں ان کے مطابق کھلے یعنی کہ ریاستیں جن کی آبادی ہندو اکثریت پر مشتمل ہو گی ہندوستان کے ساتھ ملحق ہے وہ ہندوستان میں شامل ہوں اور جن کی آبادی مسلم اکثریت پر مشتمل ہے، اور پاکستان سے متصل ہوں گی پاکستان کے ساتھ الحاق کریں گی میں اس معاہدے کی پابندی پر قائم ہوں۔ تم لوگ حیدر آباد سے اور جوناگڑھ سے نکل جاؤ جہاں کچھ مقامی مجاہدین نے شورش برپا کر رکھی ہے ورنہ ہمیں ان کے خلاف فوجی اقدام کرنا پڑے گا۔ چونکہ اس ریاست کی آبادی کی اکثریت ہندو ہے پاکستان کے ساتھ مواصلاتی ذرائع بھی کوئی نہیں لہٰذا یہ ریاست ہندوستان کے لئے چھوڑ دی جائے اس کے بدلے میں ہندوستانی فوجیں کشمیر سے واپس آجائیں گی اور کشمیر پاکستان کے ساتھ الحاق کر سکتا ہے"

یہ پیغام پہنچانے کے بعد ماؤنٹ بیٹن گورنر ۰دو دی کی رہائش گاہ گورنمنٹ ہاؤس جا کر سو گیا اور ہم میں سے دو یا تین لیاقت علی خان کے پاس گئے میں نے کہا ہمارے پاس فوجوں کو کشمیر بھیجنے کی گنجائش نہیں۔ جب میں بٹالین کا مطالبہ کرتا ہوں تو مجھے ایک کمپنی بھی نہیں دی جاتی۔ ہم یہ جنگ ہارنے کے لئے لڑ رہے ہیں۔ کیوں نہ پٹیل کی یہ پیشکش کہ حیدر آباد کے بدلے کشمیر لے لیا جائے والی تجویز قبول کر لی جائے اس لئے کہ حیدر آباد پر ہمارا اصولی حق بھی نہیں بنتا"۔

لیاقت علی نے میری طرف گھوم کر جواب دیا "سردار صاحب۔ کیا سمجھتے ہو کہ میں پاگل ہو گیا ہوں؟ جو یہ تجویز مان لوں کہ میں حیدر آباد جو صوبہ پنجاب سے بڑا ہے کو کشمیر پر چند پہاڑیوں کے عوض چھوڑ دوں"

میں یہ جواب سن کر ہکا بکا ہو گیا۔ میں حیران تھا کہ پاکستان کا وزیراعظم اتنا جغرافیہ بھی نہ جانتا تھا کہ کشمیر جس کے دریا پنجاب کو سیراب کرتے تھے کشمیر جو پاکستان کے لئے ایک شہ رگ کے مترادف تھا اس کی حیثیت ہمارے وزیراعظم کے نزدیک صرف چند چٹانوں کی تھی۔ ہمارے وزیراعظم کی یہ امید کہ ہم حیدر آباد دکن کو حاصل کر لیں گے جس کی سمندر یا خشکی سے ہماری کوئی رسائی نہ تھی ایک بے کار اور لاحاصل امید تھی۔ جب کشمیر پر حملہ ہوا لیاقت علی خان لاہور آئے۔ ان کے اور ماؤنٹ بیٹن کے درمیان کشمیر پر گفتگو کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ کشمیر کی کہانی کا بقیہ حصہ سب کے علم میں ہے۔ اس کا مقدمہ یو این او میں پیش ہوا۔ سیکورٹی کونسل نے قرار دادیں پاس

کیں۔ کئی بار ثالث مقرر ہوئے۔ نہرو نے ریفرنڈم قبول بھی کر لیا۔ لیکن اسے عملی شکل کبھی اختیار نہیں کرنے دی۔ کشمیر پر قبضہ کے بعد وہ اپنے وعدوں سے پھر گیا۔ ہم نے کشمیر کی جنگ میں ہزاروں لوگ ضائع کیے اور لاکھوں کو ہندوستان کا غلام بنا دیا۔ یو این او کی قرار دادیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ وہ اسی صورت میں یو این او کی قرار داد تسلیم کرتا جب ہندوستان کے لئے فائدہ مند ہوتی۔

ایک بار میں اور میری بیگم نئی دہلی میں پنڈت نہرو کے گھر ڈنر پر مدعو تھے۔ نہرو نے مجھ سے پوچھا "شوکت پاکستان میں لوگ میرے متعلق کیا سوچتے اور کیا کہتے ہیں؟" میں نے کہا "پنڈت جی منسٹر کیا آپ اپنے دوستوں کا رد عمل جاننا چاہتے ہیں یا عام لوگوں کا؟" اس نے کہا "بلاشبہ میں صرف دوستوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں" میں نے کہا "آپ کے دوستوں کا خیال ہے کہ ہندوستان کو ایک عظیم وزیراعظم مل گیا ہے جبکہ ایشیا ایک عظیم تر لیڈر سے محروم ہو گیا ہے جو ایشیا کو اکٹھا کر سکتا تھا" "کیوں؟" اس نے کہا۔ میں نے جواب دیا "پنڈت جی آپ ہندو متحدہ خاندانی سسٹم پر یقین رکھتے ہیں؟ فرض کریں آپ کے والد مر جاتے ہیں اور آپ کا چھوٹا بھائی اصرار کرتا ہے کہ اسے حصے میں ایک فالتو غسل خانہ چاہئے جو اس کے کمرے سے ملحق ہے۔ اس مطالبے کی بنا پر خاندانی سسٹم توڑ کر الگ ہو جائیں گے؟"

انہوں نے کہا "تمہارا اشارہ کشمیر کی جانب ہے جبکہ کشمیر میرا جذباتی مسئلہ ہے"

اس بات پر مسرت نے مڑ کر کہا "محض اس لئے کہ پنڈت جی آپ کے کشمیر یوں میں تیسری نسل ہیں" اس نے جواب دیا "ہاں" میری بیوی نے پھر کہا "تو میں بھی تیسری نسل کی کشمیری ہوں۔ میں بھی اتنا ہی کشمیر سے محبت کرتی ہوں جتنا کہ آپ کرتے ہو"۔ پھر نہرو نے ایک بودی دلیل کا سہارا لیتے ہوئے کہنا شروع کر دیا "اگر میں اب کشمیر چھوڑ دیتا ہوں تو آبادی میرے خلاف ہو جائے گی اور میں ہندوستان میں بسنے والے مسلمان کی حفاظت نہیں کر سکوں گا۔ لہٰذا اس فیصلے کو بدل دینا خطرناک ہے"

جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے قدیم محاورے کو ثابت کرنے کے لئے پنڈت نہرو کی یہ ایک انتہائی کمزور اور بودی دلیل تھی جبکہ حقائق کی رو سے پنڈت نہرو ایک غیر منطقی رویہ اپناتے ہوئے پرانی نفرتوں میں کمی نہ کر سکا۔ نہ وہ مسلمانوں کے خوف کو دور کر سکا جس کا شکار وہ مسلسل چلے آ رہے ہیں۔

میں نے اسے بتایا کہ کشمیر کا مسئلہ پاکستان کو اگرچہ نقصان پہنچائے گا لیکن آخر کار یہ ہندوستان کو بھی بلکانستان کی کارروائی میں الجھا دے گا۔ میں نے مشورہ دیا کہ ہمیں اپنے مسائل

حل کر لینے چاہئیں۔ اگر ہم اس باہمی مسئلے کو آپس میں حل کر لیتے ہیں تو ہم مشترکہ دفاع کر کے غیر ملکی حملوں سے اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں۔ اس نے پوچھا اپنی لاج رکھنے کے لئے اس مسئلے کا کیا حل ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا Condiminium یعنی مشترکہ نگرانی وہ اس طرح کریں کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں اپنے اپنے ہائی کمشنر سرینگر میں رکھیں۔ دونوں ملک کشمیر کے دفاع کے ضامن بن جائیں اور آزادانہ طور پر ہر دو ممالک کے باشندے کشمیر میں آتے جاتے اور امن کے ساتھ رہتے ہوئے جھیل ڈل میں آم چوس سکیں۔ انہوں نے کہا یہ ایک مناسب حل ہے پھر کہا کیا میں پاکستان والوں کو اس کے لئے قائل کر سکوں گا۔ بدقسمتی سے پاکستان کے ارباب اختیار نے اتفاق نہ کیا۔ بعد میں کشمیر کا مقدمہ شملہ معاہدے کی صورت میں بھٹو کے ہاتھوں تباہ ہوا۔

تین نسلیں گزر چکی ہیں۔ پنڈت جی اب اس دنیا میں موجود نہیں۔ ان کی بیٹی جو ان کے مقابلے میں زیادہ سخت گیر واقعہ ہوئی تھی جو مشرقی پاکستان پر حملہ کر کے اپنے اقتدار کو بچا گئی تھی وہ بھی دنیا چھوڑ گئی۔ اس کا بیٹا راجیو جس کے لئے بھٹو کی بیٹی نے سکھوں سے بے وفائی کی اور کشمیریوں کو ہندوستان کی فوج کے جبر کے سامنے بے نقاب کر دیا۔ وہ راجیو بھی اب اس دنیا میں نہیں۔ کیا یہ مناسب نہیں، کہ ہم سب مل کر بیٹھیں، اور کشمیر کا مسئلہ باہمی طور پر حل کریں۔ اس طرح ہم بڑی طاقتوں کی سیاست میں الجھے بغیر اپنی قوت حاصل کریں۔ معصوم لوگوں کی نسل کشی، قتل اور آبروریزی کی بجائے کیوں نہ دونوں ممالک کے لیڈر مدبر سیاستدان بن جائیں جس کی دونوں قوموں کو شدید ضرورت ہے۔

قیام پاکستان کے لئے نئی وجوہات کا اختراع

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ہمیں ان وجوہات کا علم ہونا چاہئے جن کی بنا پر مسلمانوں نے اپنے لئے ایک علیحدہ مملکت کا قیام ضروری سمجھا۔ بنیادی طور پر مسلمانوں کو انگریزوں کے اقتصادی و معاشی غلبے اور ہندو سود خواروں سے نجات دلانا تھا۔ جنہوں نے مسلمانوں کا استحصال اور خون چوس کر انہیں کمزور کر دیا تھا۔

سب سے پہلے یہ بات ہر ایک کے ذہن میں واضح ہو جانی چاہئے کہ بانی پاکستان نے قرار داد لاہور کے فوری بعد امریکن پریس کو ایک انٹرویو دیا تھا۔ جس میں کہا تھا کہ پاکستان کی حکومت ایک ایسی حکومت نہ ہوگی جس کی مذہبی حکومت کی حیثیت اور نہ ہی ہم ایسی خالص مذہبی حکومت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ بات ۱۹۴۰ء میں کہی گئی جس وقت دیوبند کے بنیاد پرست علما جیسا کہ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد پاکستان کی مخالفت میں کانگرس کی رہنمائی کر رہے تھے۔ دوسری

طرف عام معروف مذہبی رہنما جیسا کہ مظہر علی اظہر پاکستان کی مخالفت میں اتنا آگے چلے گئے تھے کہ وہ قائداعظم کو کافراعظم کہنے لگے۔ دوسرے علما بھی جیسا کہ عطاءاللہ شاہ بخاری اور بہت سے مفتی صاحبان پاکستان کے قیام کی مخالفت میں برسرپیکار تھے۔ آج وہ کس منہ سے پاکستان کو دارالسلام اور صرف اسلام ہی کو اس کی تخلیق کا باعث قرار دے رہے ہیں۔ وہ شاید اس مقولے پر عمل کرتے دکھائی دے رہے ہیں کہ لوگوں کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ اور وہ ایسے علما کا کردار بھول چکے ہوں گے جو جنگ آزادی کے دوار وں پاکستان کے متعلق تھا۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ ہمارے ان پڑھ عوام بھی اسے قبول کرنے کو تیار نہیں۔ کوئی انہیں محدود وقت کے لئے گمراہ کر سکتا ہے لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں۔

ہمارے ساتھ صرف وہ علما تھے جو نواب صاحب آف محمود آباد کے دوست اور فرنگی محل سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا غلام مرشد جو خطیب شاہی مسجد لاہور ہماری ہمدردی میں ہمارے ساتھ اس وقت شامل ہوئے جب مجھے پنجاب کیبنٹ سے برطرف کیا گیا تھا۔ دوسرے بڑے عالم مولانا عبدالحامد بدایونی تھے جو مسلم لیگ کے لئے کام کر رہے تھے۔ علاوہ ازیں چند دوسرے چھوٹے علما نے بھی ہمارا ساتھ دیا۔ ان علما کو چھوڑ کر ۱۹۴۶ء تک کسی معروف عالم دین نے تحریک پاکستان میں حصہ نہیں لیا۔

مولانا شبیر احمد عثمانی جو بریلوی فرقہ کے نامور عالم دین تھے ایک رات خواب میں دیکھا کہ ان کے استاد محترم نے ان کو بتایا کہ ان کے استاد نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں اپنے گھر سے باہر آتے ہوئے دیکھا۔ وہاں پر تمام ہندوستان اور دیوبند کے علما صف بستہ کھڑے تھے۔ تاکہ انہیں حضورؐ خطاب کریں۔ قطار کی دوسری طرف حضور صلعم نے ایک دبلے پتلے. لمبے یورپی لباس پہنے عمر رسیدہ آدمی کو دیکھا جو ملاقات کا منتظر تھا لوگوں نے کہا کہ وہ مسٹر جناح ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علما کی جانب پشت کر دی اور سیدھے جناح کی طرف گئے اور اسے سینے سے لگا لیا۔ دوران خواب مولانا شبیر احمد عثمانی کو ان کے استاد نے حکم دیا کہ قائداعظم کے پاس جاؤ اور فوراً اس کے سیاسی مرید بن جاؤ۔ چنانچہ مولانا نے قائداعظم سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ قائد نے نواب شمس الحسن آفس سیکرٹری مسلم لیگ کو مولانا کے قیام دہلی کے دوران ان کی مناسب دیکھ بھال کا حکم دیا۔

اب میں پیروں اور صوفیوں کے کردار کا ذکر کروں گا۔ پنجاب کے پیروں میں سے صرف چند ایک ایسے ہیں جنہوں نے تحریک پاکستان میں مدد کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ سب سے پہلے پیر جو ہمارے ساتھ شامل ہوئے وہ پیر صاحب آف تونسہ شریف تھے جو شادی کے رشتے

سے نواب ممدوٹ سے منسلک تھے۔ ان کے خلیفہ پیر قمرالدین آف سیال شریف نے ان کی تقلید میں تحریک میں شمولیت کی۔ پیر صاحب آف گولڑہ شریف اپنے بزرگ اتالیق پیر آف سیال شریف کی تقلید میں ہمارے ساتھ شامل ہوئے۔ دوسرے پیر جلال پور والے تھے جو راجہ غضنفر علی کے قریبی رشتہ دار تھے تحریک میں حصہ دار بنے۔ علاوہ ان کے تین پیر صاحبان جو مجھے یاد ہیں وہ تھے پیر جماعت علی شاہ، پیر مانکی شریف اور پیر صاحب آف زکوڑی شریف صوبہ سرحد۔ یہ تینوں پیر صاحبان براہ راست تحریک میں شامل ہوئے اس لئے کہ انہیں یقین تھا کہ قائداعظم ایک بڑے مقصد کے لئے لڑ رہے ہیں۔

لہٰذا آج یہ کہنا کہ پاکستان کو اسلامی بنیاد پرستی کے فروغ کے لئے بنایا گیا تھا قائداعظم پر جھوٹا الزام دھرنے کے مترادف ہو گا۔ اس لئے کہ باقی سب صاحبان مذہب کی اکثریت، کیا پیر کیا عالم دین، قیام پاکستان کے حمایتی نہ تھے۔ اگر وہ تحریک پاکستان کو تحریکِ اسلام سمجھتے تھے جیسا کہ وہ آج کہتے ہیں تو پھر انہوں نے اس وقت پاکستان کی حمایت کیوں نہ کی؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ سب لوگ بڑھ چڑھ کر اس تحریک کی مخالفت کر رہے تھے۔ انہوں نے اس تحریک کو نہ اسلامی سمجھا نہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بھلائی کا علمبردار تسلیم کیا۔ آج وہ بچوں کے لگائے گئے نعروں کو جیسا کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ اللہ (پاکستان کا مطلب ہے اللہ ایک ہے) کو نعرہ پاکستان کہہ رہے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ یہ نعرہ قائداعظم یا ہم میں سے کسی نے نہیں لگایا۔ اس نعرے کا مطلب بھی غیر واضح ہے۔ خدا تو وہی ہے جو مسلمانوں، ہندوؤں، عیسائیوں اور یہودیوں کا ہے۔ ہم اسے مسلمانوں کی واحد ملکیت قرار نہیں دے سکتے اور بھی اسی قسم کے بہت سے نعرے تھے جو بچے لگایا کرتے تھے لیکن ہمارے لیڈر یا ہم میں سے کسی نے بھی ایسا نعرہ نہیں لگایا۔ آج مولانا مودودی کی جماعت اور جنرل ضیا جنہوں نے اپنے آپ کو اسلام کا واحد محافظ قرار دے رکھا تھا کہہ رہے ہیں کہ یہ نعرہ پاکستان کا نعرہ تھا۔ جبکہ جنرل ضیا نے اسلام کا صرف لبادہ اوڑھ کر اپنے محسن ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار پر لٹکا دیا اور اپنے بہت عیوب کی پردہ پوشی کے لئے اختیار کیا۔

اگر میرے قائد کی پاکستان کو ایک مذہبی ریاست بنانے کی خواہش ہوتی تو وہ ایک سچے اور کھرے اور بےلاگ انسان کی حیثیت سے اس کا برملا اظہار کر دیتے۔ ان کی سکیم میں پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان، بنگال اور آسام پاکستان میں شامل تھے۔ ان صوبوں میں ہندو اور مسلمان دونوں بستے تھے۔ وہ اس قسم کا نعرہ کیسے لگا سکتے تھے۔ لہٰذا ایک ایسا نعرہ جو صرف ایک ہی قوم کے لئے مخصوص ہو ان کے تصور میں بھی نہ آ سکتا تھا۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ ان کے ملک میں تمام قومیتیں بسیں گی اور پاکستان صرف مسلمانوں کی واحد ملکیت نہ ہو گا۔ انہوں نے یہ بھی کبھی نہ

سوچا تھا کہ کسی پلان کے تحت وہ تمام آبادی کا تبادلہ کر لیں گے۔ آج قیام پاکستان کی بہت سی تعبیرات سنائی دے رہی ہیں۔ ڈس انفارمیشن پر مبنی یہ فہم اس نام نہاد ۳۵ نکات پر مشتمل کارڈ کی صورت میں پھیلائی گئی جسے پاکستان کے قیام کی بنیاد قرار دیتے ہوئے ۴۹ - ۱۹۴۸ء میں مطالبہ کیا گیا کہ اسے آئین کا حصہ بنایا جائے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کے اطمینان کے لئے آئین کے ابتدائیہ کے طور پر ان الفاظ میں اظہار کیا گیا "مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ اپنی زندگیاں انفرادی یا اجتماعی اسلام کی تعلیمات کے مطابق ڈھالیں گے۔ جیسا کہ قرآن اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں درج ہے اور اپنا معاشی نظام اسلامی ضابطوں کے مطابق استوار کریں گے"۔

قائد نے ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی قانون ساز اسمبلی میں اپنے پہلے خطاب میں کہا "پاکستان میں آج کے بعد کوئی ہندو ہو گا نہ مسلمان (مطلب یہ کہ تمام پاکستانی ہوں گے) ہندو اپنے مندروں میں اور مسلمان اپنی مسجدوں میں اور دوسرے اپنی عبادت گاہوں میں جائیں گے اور ریاست کو ان کے مذہب سے کوئی سروکار نہ ہو گا"

کیا کوئی ان الفاظ کو جھٹلا سکتا ہے اور جو لوگ قائد کا نام اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے یا کسی مذہبی آمریت کے لئے یا اپنے آپ کو بچانے کے لئے استعمال کر رہے ہیں شدید غلطی پر ہیں۔ ایک آمر نے اپنی غلط کاریوں کے بچاؤ کے لئے اسلام کو بطور ڈھال استعمال کیا۔ ہمیں مخلص، سچے، دیانتدار اور ثابت قدم مسلمان بن کر اس قائد کی پیروی کرنی چاہئے جو ان صفات کا حامل تھا۔ افسوس کا مقام ہے کہ ہم نے قائد کے فرمودات کو پس پشت ڈال دیا۔ اس کے نقش قدم پر چلنے کی بجائے پاکستان کو اپنی ذاتی دولت بڑھانے کے لئے جائز و ناجائز طریقے سے استعمال کر رہے ہیں۔ اور اکثریت نے قائد کے فرمودات کو بھلا دیا۔

میں ان لالچی، بد دیانت سیاستدانوں اور بیورو کریٹوں وہ سویلین ہوں یا فوجی، بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان غربا کے گھر کے طور پر بنایا گیا تھا اس اکثریت کے لئے بنایا گیا جو غریب، پسماندہ اور محرومیوں کا شکار تھی۔ پاکستان سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی بھلائی کے لئے نہیں بنایا گیا تھا۔ پاکستان بنانے کا مقصد یہ تھا کہ ان محروم شدہ طبقات کو برابر کے حقوق ملیں گے۔ کسی کو غریب کسان اور ہاڑی کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی اجازت نہ ہو گی۔ اس طرح شہروں میں بسنے والے سرمایہ داروں کو مزدوروں کی محنت کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہ ہو گی۔ بدقسمتی سے ایک نام نہاد بڑے مسلمان جنرل ضیاالحق اور اس کے ساتھیوں کے دور میں وہی کچھ ہوتا رہا جس کی اجازت قائد نے کبھی نہ دی۔ سب غریب کو لوٹنے کے درپے رہے۔ آج بہت کم مسلمان ایسے ہیں جو خالص اسلامی فکر پر عمل پیرا ہو کر، قائداعظم کے فرمودات کے مطابق ذاتی دولت بڑھانے کی

بجائے غریبوں، کسانوں اور مزدوروں کو معاشی آزادی اور سرمایہ داری کے جبر سے نجات کا ذریعہ بنے ہوں۔

کیا ہمیں یہ دیکھ کر شرم نہیں آتی جب ہم غیر ملکی اخبارات و رسائل میں پڑھتے ہیں کہ پاکستان کے لیڈر اور جرنیل دنیا کے امیر ترین لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس یہ دولت کہاں سے آئی؟ میں ان میں سے بیشتر کی کمائی کے پس منظر کو جانتا ہوں۔ ان میں سے ایک نے بھی اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر جائز طریقے سے دولت نہیں کمائی۔ ہم عرصہ ہوا عادلانہ راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ آج ہم ان ڈاکو بیرنز Robber Borons سے بھی برے ہیں۔ ہم ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ کیا وہ لوگ اسلام کے دوسرے خلیفہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پر چل سکتے ہیں جنہوں نے مال غنیمت میں سے اپنے لئے صرف ایک چادر لی اور جب دیکھا کہ صرف ایک چادر سے کرتہ نہ سل سکے گا تو انہوں نے اپنے بیٹے کے حصے کی چادر بھی شامل کر کے کرتہ سلوایا۔ جب انہوں نے یہ کرتہ پہنا تو ایک عام مسلمان نے بر سر عام کھڑے ہو کر اعتراض کیا "عمرؓ تمہارے لئے یہ کیسے ممکن ہوا کہ تم ایک چادر سے کرتہ سلوا سکو جس کا پہننا جو تمہارے جسم کی مناسبت سے ممکن نہیں" جواب میں حضرت عمرؓ نے وضاحت کی کہ کس طرح انہوں نے اپنے بیٹے کی چادر شامل کر کے کرتہ سلوایا تھا۔ یہ تھی اصل بڑائی اور عظمت۔ آج کی طرح نہیں کہ راتوں رات امیر بنا جائے اور دنیاوی جاہ و جلال کی نمائش کی جائے اسلام کی بڑائی کھوکھلے نعروں میں پنہاں نہیں نہ ہی اس منافقت میں پنہاں ہو سکتی ہے جو آج کے حکمران کر رہے ہیں۔ ہماری تحریک ایک غیر فرقہ وارانہ تحریک تھی۔ ہم وہ انداز زندگی چاہتے تھے جو پیغمبر اسلام کا تھا۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی روز مرہ زندگیوں میں مساوات. بھائی چارے اور اخوت فروغ دیگر اسلام کا عملی نفاذ کریں۔

میں نے یہ وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان کی تخلیق کا مقصد وہ نہیں تھا جو بنیاد پرستوں کا پیش کردہ ہے۔ قائداعظم خود اپنے بڑے پن کے باوجود شاید بعض اسلامی ہدایات پر مکمل طور پر پابند رہنے والی شخصیت نہ تھے۔ لیکن وہ منافق نہ تھے۔ وہ کہا کرتے تھے "آپ لوگ مجھے اسلام کا مخلص اور نچوڑ نہ سمجھیں۔ میں شاید ایک اچھا مسلمان نہیں ہوں لیکن میں آپ لوگوں کا وکیل ہوں جو بستہ اٹھائے یہ دیکھنے کے لئے میدان عمل میں ہے کہ مسلم برادری کے لوگ کچلے نہ جائیں اور ان کا خون ہندوستان کے سود خور امیر بنئے چوس نہ لیں" وہ ایک عملی انسان تھے۔ وہ ملک کو اسی طرح دیکھنا چاہتے تھے جیسا خود تھے۔ جہاں تک اصلاح کا تعلق تھا وہ اسلام کے ظاہری رسوم و آداب کے برعکس اصل کیریکٹر کے احیا پر زور دیتے تھے۔ ان لوگوں کی طرح نہیں جو اپنی

بدعنوانیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے اسلام کو بطور ڈھال استعمال کرتے ہیں۔

اگر آپ ایک ہاتھ سے عشر و زکوٰۃ ادا کر رہے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے غیر اسلامی اعمال کر رہے ہیں تو آپ کو سوائے منافق کے اور کیا کہا جائے گا؟ اور منافقین پر اسلام نے لعنت بھیجی ہے۔ میں ایسی سینکڑوں مثالیں دے سکتا ہوں جہاں لوگوں نے مذہب کے نام پر جرم کیے۔ ان میں عیسائی بھی تھے. مسلمان بھی اور یہودی بھی۔ اس چیز نے انہیں بہتر عیسائی، مسلمان یا یہودی نہیں بنایا۔ اچھا مسلمان ناانصافی سے سخت نفرت کرتا ہے اور ناانصافیاں آج بہت سے ملکوں میں پاکستان کے بشمول خدا اور اسلام کے نام پر کی جارہی ہیں۔

یہ توقع رکھنا کہ ہم قوانین اور ان کے استعمال کے لئے چودہ صدیاں پیچھے چلے جائیں آج کے جدید حالات اور صورت حال سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ ایک طرح کی حماقت ہوگی اور غیر اسلامی بھی یہ اسلام کو قریب المرگ بنا دے گا۔ اسلام کہتا ہے کہ اللہ ہر روز نئے نئے طریقے دکھاتا ہے اور نئے نئے معجزے روبہ عمل لاتا ہے۔ جو اس سے قبل انسانیت کے علم میں نہ تھے۔ مجھے یاد ہے جب ریڈیو ہندوستان میں متعارف ہوا تو مجھے کہا گیا تھا کہ ریڈیو نہ سنو۔ ان کے خیال میں یہ شیطان کی آواز تھی جو سپیکر سے برآمد ہو رہی تھی۔ اگر یہ اسلام تھا تو کوئی مسلمان بھی زندگی کی نئی حقیقتوں سے آگاہ نہیں ہو سکتا یا نئی سائنس کی ایجادات نہیں سمجھ سکے گا۔ اس طرح وہ حقائق اسلامی مذہب کی سچائیوں کی دسترس سے باہر ہو جائے گا۔ اسلام اس قابل ہونا چاہئے کہ ان تمام علوم اور ایجادات کو انسانیت کے تصرف میں لا سکے جو آج سے چودہ سو سال پہلے انسانی سمجھ سے باہر تھیں اور بعد میں ظہور میں آئی ہیں۔

تیسری دنیا میں مغرب کی رواج کردہ جمہوریت

بہت عرصہ گزرا کہ ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی اور یہ وہ وقت تھا جب ان کے زیر تسلط علاقوں پر سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ میں ان دنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں جو انگریزوں کا قائم کردہ ایک معروف ہندوستانی ادارہ تھا. پڑھتا تھا۔ جہاں پر کالج کا ہر شعبہ برطانوی اساتذہ کے زیر تسلط تھا۔ ہمیں سکھایا جاتا کہ برطانوی طرز حکومت ہی بہترین حکومت ہے۔ وہاں جمہوریت کی تعریف کے پل باندھے جاتے اور اسے آسمانوں کی بلندیوں تک لے جایا جاتا۔ ہمیں ذہن نشین کرایا جاتا کہ آمریت خواہ وہ کسی بھی قسم کی ہو خواہ وہ مسولینی کا فاشزم ہو یا ہٹلر کا نازی ازم اتنی ہی بری ہیں جتنا سٹالن کا کمیونزم۔ پارٹی کی آمریت مکروہ اور ناپسندیدہ بتائی جاتی۔ آئے دن ہمارے اساتذہ ڈکن. سن. گیرٹ اور بعد میں میرے ڈیڑھ دون ملٹری اکیڈمی کے انگریز انسٹرکٹر ہمارے

دماغوں میں بھرتے رہتے کہ ہر شریف آدمی کا فرض بنتا کہ وہ ہر قسم کی یک جماعتی آمریت کے خلاف جنگ کرے۔ ہمیں بتایا جاتا کہ جمہوریت کے سوا ہر طرز حکومت برا ہے۔ چنانچہ ایک سچے ڈیموکریٹ کی حیثیت سے ہماری مکمل برین واشنگ کی گئی تھی۔

یہاں تک کہ ہم اسے تقریباً ایک مذہبی حقیقت ماننے لگے۔ یک جماعتی آمریت افریقہ میں مسولینی کے ذریعے اپنے پنجے گاڑ رہی تھی۔ ادھر مشرقی یورپ میں ہٹلر کے نازی اپنے پھن پھیلائے بیٹھے تھے۔ ان مثالوں کی مدد سے ہمیں قائل کیا گیا کہ آمریت کے خلاف جنگ آزادی کے مترادف ہوگی۔ اور آزاد ہندوستان کے لئے جمہوری طرز حکومت ہی بہترین ثابت ہوگی۔ مسلمان قوم کے لئے وہ جہاں کہیں بھی ہوں جمہوری طرز حکومت ہی اسلام کے قریب تر تھی۔ جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی صورت میں کر کے دکھایا تھا۔ پس جمہوریت پر میرا ایمان پکا ہو گیا۔ یہاں تک کہ میں نے سولہویں کیولری (پہلی مدراس لانسرز) کو بدل کر سکنرز ہارس (پہلی بنگال لانسرز) میں شمولیت اختیار کر لی اس لئے کہ وہ محاذ جنگ پر پہلے جا رہی تھی تاکہ میں جمہوریت کے مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنے آپ کو اولین حصہ داروں میں شامل کر سکوں۔ دوران جنگ میں زخمی ہوا، قیدی بنا بعد میں اپنی ہی فوجوں کی وساطت رہائی ہوئی اس وقت جس وقت انہوں نے اری ٹیریا فتح کیا۔ میں لنڈن میں بمباری کے دوران موجود رہا۔ مغربی صحرا میں جنگ لڑی۔ میں ہندوستان کی آزادی کے لئے امریکی تعاون و مدد سے بہت متاثر تھا۔

جمہوریت کے اس پیرو کار کو پہلا دھچکا اس وقت لگا جب یالٹا کانفرنس میں مشرقی یورپ کو بغیر لوگوں کی رائے معلوم کیے کیمونسٹ آمریت کی گود میں ڈال دیا گیا۔ مجھے بہت سے دھچکے اس وقت لگے جب امریکہ نے جمہوری چین کے خلاف چیانگ کائی شیک کی حمایت کی۔ اور سنگ مین ریحہ کی یک جماعتی آمریت کا تعارف جنوبی کوریا میں کرایا۔ پھر مارکوس اور اس کے پیش رو راموں لوس کی فلپائن میں، ڈی ایم اینڈ کمپنی کی ویت نام میں، جنرل سوہارتو کی انڈونیشیا میں، ایوب خان، یحییٰ اور ضیا کی پاکستان میں، شاہ ایران کی ایران میں، جنرل نجیب کی مصر میں، جنرل گرسل اور دوسرے جرنیلوں کی ترکی میں، بورگیبا کی تیونس کی میں اور بادشاہ محمد کی مراکش میں حمایت کی۔ انہوں نے سپین میں جنرل فرانکو کو برداشت کیا۔

یہ سارا منظر نامہ غداری اور دغا کے مترادف تھا۔ جس کی بنا پر میرا اعتماد ان نام نہاد جمہوریت کے پرچار کرنے والوں پر سے اٹھ گیا۔ ایک انتہائی بودا جواز یہ پیش کیا گیا کہ جمہوریت صرف اینگلوسیکسن اقوام کو ہی راس آتی ہے۔ اور ان لوگوں میں پھلتی پھولتی ہے جو سرد آب و ہوا کے باسی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اینگلو امریکن وہی درس دیتے ہیں جو ان کے مقاصد کے حصول

کے لئے بہترین ہوتا ہے۔ ہم میں سے بعض مایوس اور دل شکستہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ وہ سوویت روس کی پیروی کریں جو کیمونسٹ مقاصد کی تکمیل میں تھا یا ان نام نہاد جمہوریت پسندوں کی جو شہنشاہیت یا سرمایہ داری کے مقاصد کی تکمیل میں مصروف تھے۔ مختصر یہ کہ ان عوامل نے جمہوریت کے ساتھ وفاداری پر میرا ایمان متزلزل کر دیا۔ پولٹ بیورو اور انگریزی امریکی جمہوری وزارتیں ایک جیسی نظر آنے لگیں۔ پاکستان جو ہم نے گولی کی بجائے ووٹ سے حاصل کیا یہاں پر امریکی برطانوی رویہ نے ہمیں ڈانواں ڈول کر دیا حالانکہ ہم لوگ صاحب ایمان جمہوری لوگ تھے۔ امریکیوں کا یہ فرمان کہ مضبوط حکمران اور ملکی استحکام ایک ہیں ایک مغالطہ آمیز نعرہ تھا جس کی بدولت انہوں نے تیسری دنیا کے ممالک میں اپنی پسند کے آمروں یا مضبوط حکمرانوں کو حکومتی معاملات چلانے کے لئے لا کھڑا کیا۔ اور ان لوگوں کو نظرانداز کر دیا جو اپنے ملکوں کی آزادی کے لئے لڑے، جنہوں نے ملکی مفاد اور جمہوریت کو یکساں سمجھا۔ یہ جمہوریت پسند لوگ امریکی رویئے سے انتہائی مایوس ہو گئے۔

شروع میں کلکتہ برطانوی تجارت اور صنعت، کا بڑا مرکز بن گیا۔ یہیں سے برطانیہ کو مقامی فوج بھی دستیاب ہوئے۔ لارڈ ہیسٹنگ (Hastings) نے مقامی غداروں بنگال کے میر جعفر اور دکن کے صادق کی ملی بھگت اور اعانت سے مسلم حکمرانی کو تباہ کیا۔ انگریز سوداگروں نے زیادہ تر انہی جیسے قابل فروخت مقامی لوگوں کی غداریوں کے ذریعے اپنا راستہ بنایا۔ بعد میں کلکتہ غلط تقسیم کی بنا پر ریڈ کلف ایوارڈ کے ذریعے ہندوستان کے سپرد کر دیا گیا۔ انگریزوں نے پنجاب میں سکھوں کو، سندھ میں میروں کو اور بلوچستان میں بلوچ سرداروں کو بھی اپنا مطیع بنالیا۔

ہندوستان برطانوی، ہندی ریاستی حکومتوں میں تقسیم ہو گیا۔ ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں نے انگریزوں کی محدود فرمانروائی کو تسلیم کر لیا اور عہد اطاعت کیا۔ انگریز کو فوجی فراہم کیے یا دوسرے لفظوں میں ان کے اشاروں پر ناچنے والے بن گئے۔

برطانوی نو آباد کارانہ حکومت نے ہندوستان کو اپنی واحد ملکیتی سونے کی کان کی طرح استعمال کیا۔ یہ حکومت برطانوی تاج کے لئے ہیرہ تصور کیا جانے لگا اور برطانوی آمدنی کا بڑا ذریعہ بن گیا۔ یہ ایک ایسی منڈی تھی جہاں پر برطانیہ میں تیار شدہ اشیا دیا سلائی سے لے کر مشین تک بلاشرکت غیرے فروخت ہوتی تھیں۔ ہندوستان برطانوی باشندوں کو نوکریاں فراہم کرتا اور انہیں تربیت دیتا۔ انہوں نے اس تربیت کا آغاز بمبئی، مدراس اور کلکتہ سے کیا۔ انہوں نے اپنے تمام تر مخالفت تلوار، سازشوں، رشوت اور غداری کے ذریعے ختم کر دی۔ اپنی منشا کے مطابق معاشی سہولت کے لئے ریاستیں اور صوبے تخلیق کیے۔

جہاں تک قابل سیاسی عمل سیلف رول کا تعلق تھا یہ ایک طویل سلسلہ تھا۔ جس کا آغاز جزوی میونسپل حکومت سے کیا گیا۔ پھر صوبوں میں دو عملی رائج کی گئی وہ اس طرح کہ غیر آمدنی والے محکمے ہندوستانیوں اور فنانس اور مال کے محکمے برطانوی کنٹرول میں رکھے گئے۔ جہاں تک مرکزی حکومت کا تعلق تھا برطانوی پارلیمینٹ نے ایک ضابطہ بنا رکھا تھا کہ مرکز میں عمل در آمد اس کے ذمہ ہو گا جب تک ہندوستانی ریاستوں کے چھپے حکمران اس کی منظوری دیں گے۔ سیلف حکومت رائج نہیں ہوگی کہ ان پر پولی. ٹیکل ایجنٹ سوار تھے جو ان کے کسی بھی فیصلے کو مسترد کر دینے کا حق رکھتے تھے۔ دوران جنگ تو اسے آسانی کے ساتھ ملتوی کر دیا گیا تا آنکہ یہ موثر اس وقت ہوا جب ایکٹ آزادی اگست ۱۹۴۷ء میں پاس ہوا۔

مسلمانوں نے میرے والد کی طرح اس امید پر جنگی کوششوں میں تعاون اور حصہ لیا کہ انہیں حق خود ارادیت کم از کم پنجاب میں تو ضرور مل جائے گا۔ جہاں پر وہ اپنی مرضی سے مقامی حکومت قائم کر سکیں گے۔ جبکہ انڈین نیشنل کانگرس دوران جنگ ۱۹۴۲ء میں "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک کا آغاز کر چکی تھی۔ میں نے کئی جلدوں پر مشتمل انتقال اقتدار کی دستاویزات کا مطالعہ کیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بارے میں چرچل کی لکھی ہوئی کتابوں کو پڑھا۔ اس تمام تر جائزے اور تحقیق کی بنا پر اور سابق منظر بینی کی بدولت اب میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ میرے والد کا بھولا پن تھا کہ پنجاب کی حد تک خود مختاری مل جائے گی۔ والد صاحب کی چرچل سے ملاقات جب قاہرہ میں ہوئی تو وہ یونیفارم کے ساتھ خاکی پگڑی باندھے ہوئے تھے۔ اس موقع پر چرچل کا کیا گیا سوال. ان پگڑیوں کا کیا کرنا ہو گا؟ برطانوی سوچ کا غماز تھا۔

جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہندوستان میں مقیم برطانوی سول سروس کے لوگ لیبر حکومت کے اعلان خود مختاری ہند کے خلاف تھے یہ ملازمین تنگ نظر، ناعاقبت اندیش اور برطانوی قوم کے خود غرض سپوت تھے۔ انہوں نے سوچا کہ وہ "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کے آزمودہ نسخے پر عمل کرتے ہوئے ہندوستانیوں کو اپنی جوتی کے نیچے رکھنے میں کامیاب ہوں گے۔ جبکہ عملی صورت حال یہ تھی کہ برطانیہ جنگ توجیت چکا تھا لیکن معاشی اعتبار سے دیوالیہ ہو چکا تھا۔ ہندوستان کی آزادی برطانیہ کے حق میں بہتر تھی اس کی تباہ حال معیشت کو سہارا دینے کا یہی طریقہ تھا کہ وہ ہندوستان کے ذمہ قرضوں کو معاف کر کے تجارت میں مزید سہولتیں اور فوائد حاصل کر کے اپنی معیشت کو سنبھالا دے بجائے اس کے کہ وہ سیاسی احتجاج سے ہمہ وقت نبرد آزما رہے اور برطانوی تیار شدہ مال کے مقاطع کا سامنا کرے دوسری جانب اس کا ساتھی امریکہ انسانی حقوق کی تنظیموں اور ہندوستان کی آزادی کی حمایت کر رہا تھا۔ یہ تھیں بڑی وجوہات جن کی بنا پر برطانیہ

ہندوستان کو سیلف رول دینے پر مجبور ہوا۔

برطانیہ کی ہندوستان میں تعینات فوج چاہتی تھی کہ شاہی دفاعی مقاصد کے لئے ہندوستان کی حالت جوں کی توں رہے جبکہ امریکی ہندوستان کی آزادی کی حمایت کر رہے تھے وہ ہندوستانی مسائل کو اپنے ان مسائل کے مماثل قرار دے رہے تھے جن کا سامنا انہوں نے امریکی جنگ آزادی کے وقت کیا تھا۔ لیکن وہ اس پیچ در پیچ مسئلے کی حقیقت سے آگاہ نہ تھے اور انتہائی بھول پن سے اسے اپنی جنگ آزادی کے ساتھ ملا رہے تھے۔ وہ ہندووانہ ذات پات، ان کے مذہبی تعصب اور ان کے نسلی مسائل سے ناواقف تھے جو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔

بعد میں امریکن اور انگریز اپنے ضمیر کو ہوش میں لائے بغیر تنگ نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سول اور ملٹری بیوروکریٹس کو کیونکہ وہ ان سے توقع رکھتے تھے کہ یہ لوگ سیاستدانوں کے مقابلے میں زیادہ لچک دار ثابت ہوں گے۔ امریکی اپنے نعروں کو بھول گئے کہ ملٹری کی برگزیدہ شخصیات کے مقابلے میں عوام بہترین لڑاکا اور اپنی آزادی اور اس کی حفاظت کے لئے بہتر دفاعی حصار ثابت ہوا کرتے ہیں۔ ان رویوں کی بنا پر ہماری عوامی سوچ اور مغربی جمہوریتوں کی سوچ میں شدید اختلاف ہوا۔ چنانچہ میرے جیسے قدیم جمہوریت پسند بھی اب اس بات کے قائل ہو گئے کہ نظریات کے ساتھ وفاداری اول و آخر خود غرضانہ ذاتی مفادات کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اپنے ظہور کے وقت پاکستان پانچ صوبوں پر مشتمل تھا۔ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش سے پہلے) پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، بلوچستان اور سندھ۔ انگریزوں نے پورے پاکستان کو معاشی طور پر پسماندہ رکھا تھا۔ صنعتی ترقی پنجاب اور سرحد سے بہت دور رکھی گئی تھی۔ یہ علاقہ فوج کے لئے بندوق کے چارہ کے طور پر مخصوص رکھا گیا تھا۔ اس علاقہ کے عوام جاگیردارانہ نظام کے تحت جاگیرداروں کے غلام بنا دیئے گئے تھے۔ بلوچستان عدم توجہی کا شکار ایک قبائلی معاشرہ بن گیا۔ بلوچ رجمنٹ کی بغاوت کے بعد اور پہلی جنگ عظیم کے دوران بلوچوں سے ترکی کے مسلمان خلیفہ کے خلاف ہتھیار اٹھوانے کے بعد انہیں ایک غیر جنگ جو قوم قرار دے دیا گیا۔ انہوں نے اپنے برطانوی مصنف کی انیسویں صدی کی اس تصنیف کو نظر انداز کر دیا جس میں مصنف نے بلوچ قوم کو ایک بہادر شخص قرار دیا تھا۔ ایک اوسط درجے کا بلوچ اپنے سرداروں کا غلام بن گیا۔ ان کا مقدر وہی ٹھہرا جو ہندوستان کی بنگال آرمی کا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہوا تھا۔ انگریزوں نے وفادار بنگالیوں کو جو ہندوستانی فوج کا ایک بڑا حصہ تھے غدر کی بنا پر انہیں غیر جنگ جو قوم قرار دے دیا تھا۔ ایک ایسی قوم جو ہتھیار اٹھانے کے قابل نہ تھی۔ میں پہلی بنگال لانسر میں اسکواڈرن لیڈر تھا۔ میں نے دیکھا کہ پورے اسکواڈرن میں ایک بھی بنگالی سپاہی نہ تھا۔ فوجیوں کی اکثریت جنہوں

نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی خاطر شمالی ہندوستان فتح کیا تھا فوج کے لئے غیر موزوں اور غیر جنگ جو قرار دی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے جنگ آزادی کے دوران وفاداری نہ دکھائی تھی۔ حتیٰ کہ ہم پنجاب میں بھی یہ بھول بیٹھے کہ بنگالی فوجی اپنی چھ ماہ کی رخصت (فرلو) کے دوران پنجاب جاکر پنجابی مسلمانوں کو سکھوں سے رہائی دلانے کی خاطر سکھ حکومت کے خلاف جہاد میں حصہ لیا کرتے تھے۔ یہ لوگ ان کاموں پر لا پھینکے گئے جیسے انڈین کیولری کے لئے گھاس کا کھودنا وغیرہ۔ اس کس مپرسی نے انہیں ہندو ساہو کار کا غلام بنا دیا۔ تقسیم اور آزادی کے بعد بھی بنگال میں اسی پرانی برطانوی نام برطانی سامراج کے پیداوار افسر شاہ کے ماتحت رکھا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بنگالی مسلمانوں میں بلوچوں کی طرح احساس محرومی اور بیگانگی پرورش پانے لگا۔

پاکستان میں بھی ہم نے اپنے آپ کو ایک آزاد اور خود مختار قوم کی بجائے پرانے برطانوی نمونے پر رکھا۔ ہم نے بلوچوں اور بنگالیوں کو فوج اور سروسز سے دور رکھا۔ زیادہ تر ملازمتیں پنجاب اور سرحد والوں کو دی گئیں۔ بلوچ رجمنٹ میں مٹھی بھر بلوچ بھرتی کیے گئے۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ کو بھی جزوی طور پر قبائلی رکھا گیا۔ کچھ حصہ پولی ٹیکل حکام کے دباؤ کے نیچے اور کچھ جاگیرداروں کی ماتحتی میں رکھا گیا۔

ہم نے نو آبادکارانہ نظام نہ بدلا صرف افسر بدل دیئے۔ انگریز کی بجائے پنجابی اور مہاجرین سول سروس کے مالک بن گئے۔ سسٹم جوں کا توں رہا۔ بدقسمتی سے پنجاب کی آبادی مغربی پاکستان کے بقیہ تین صوبوں کی آبادی سے زیادہ تھی۔ اسی فیصد فوجیوں کا تعلق پنجاب سے تھا جبکہ باقی سرحد کے تھے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ دوسرے صوبوں کے لوگ کمتر درجے کے تھے بلکہ اس لئے کہ پنجابی اپنے سابق مالکان کی نظروں میں برگزیدہ گنے جاتے تھے۔

بعد میں سندھ کی نئی نہری زمین جان بوجھ کر سابق فوجیوں اور حاضر جرنیلوں میں بانٹ دی گئی۔ ہندو جو سندھ سے چلے گئے تھے ان کی متروکہ زمینیں یوپی سے آمدہ مہاجرین کو دے دی گئیں۔ جنہیں نوابزادہ لیاقت علی خان کی حکومت کے دوران لایا گیا تھا۔

چھوٹے صوبوں کے پاس بڑ بڑانے کا پورا حق تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ بجٹ کا بڑا حصہ اور غیر ملکی امداد فوجوں پر خرچ کی جا رہی ہے۔ جہاں پر اسی فیصد لوگ پنجاب کے تھے۔ علاوہ اس کے پنجابی دوسرے فوائد بھی حاصل کر رہے تھے جیسا کہ سول سروس وغیرہ۔ حقیقت یہ تھی کہ برطانوی حکومت کے دوران پنجابی دوسرے صوبوں کے مقابلے میں سروسز میں زیادہ تھے۔ انہیں تقسیم کے بعد ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی جگہوں پر بنگال، سندھ، بلوچستان اور سرحد میں لگایا گیا۔ پنجابی سول سرونٹ کا رویہ برطانوی نو آبادکارانہ سول سرونٹس سے کچھ مختلف نہ

تھا۔

یہ ایک جزوی وجہ ہے جو پنجاب اور دوسرے صوبوں کے درمیان کشیدگی کا باعث بنی۔ مشرقی پاکستان کے ہندو نے وہاں سے ہجرت نہ کی بلکہ صرف اپنے اہل خانہ کو مغربی بنگال بھیجا۔ محکمہ تعلیم پر وہ چھائے رہے۔ تجارت ان کے قبضہ میں رہی۔ زمینوں کے مالک بھی وہی تھے۔ وہاں کے مسلمان پہلے کی طرح لکڑہارے اور پٹ سن کے کاشتکار بنے رہے۔ دوسری طرف مغربی پاکستان کے سول سرونٹس نے براؤن نو آباد کارانہ انداز اپنانا شروع کر دیا۔ بنگالی مسلمان تعلیم میں بہت پیچھے تھا۔ جس کے نتیجے میں بیروز گاری، کاروبار سے دوری اور سروسز سے اس کا مکمل اخراج ہو گیا۔ بنگالی مسلمان نے اپنی پس ماندگی کا باعث ہندو ٹیچر اور ہندو استحصال کنندہ کی بجائے مغربی پاکستان کو سمجھنا شروع کر دیا۔ انہوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ وہ آزاد نہیں ہوئے بلکہ ان کا صرف حاکم بدلا گیا تھا۔ پنجاب اور یوپی کے سول سروس کے اہلکار ان کے خیال میں انگریزوں کا متبادل تھے۔ وہ سول سرونٹس بننے کی جلدی میں تھے۔ لیکن سول سروس راتوں رات تو ظہور میں نہیں آ سکتی۔ ہندو استادوں نے ان میں نفرت کے بیج بونے شروع کر دیئے چنانچہ نوجوان طبقہ کو غیر ملکی نظریاتی تعلیم سے روشناس کراتے ہوئے ان کی تمام مشکلات اور مصائب کی جڑ مغربی پاکستانیوں کو قرار دیا۔

اسی طرح بلوچ قبائل کو بھی انگریزوں نے ان پڑھ رکھا۔ وہ اب تک اپنے قدیم وضع کے قبائلی معاشرے میں رہ رہے ہیں۔ انگریزوں نے بلوچستان میں پولیس، ڈاکٹر اور ٹیچر پنجاب یا سرحد سے بھرتی کیے۔ چنانچہ بلوچی بھی ان پنجابی ملازمین کے خلاف ہو گئے اور اپنی پسماندگی کا ذمہ دار انہیں ٹھہرانے لگے۔ حالانکہ یہ انگریز تھے جنہوں نے انہیں بنیادی طور پر تعلیم سے محروم رکھا۔ اور سروسز میں انہیں وہ مقام نہ دیا جس کے وہ حقدار تھے۔ حقیقت میں انگریز ہی ان کے مسائل کا زیادہ تر ذمہ دار تھا۔

سندھ والوں نے بھی آباد کاری کی پالیسی کی وجہ سے ہے پنجاب پر الزامات لگائے۔ سندھیوں نے پنجابیوں کو زمین کا آباد کار تسلیم کرنے والے نہ سمجھا بلکہ انہیں زمینوں کا غاصب سمجھا۔ وہ یہ بھول گئے کہ انگریز لائیڈز بیراج کی تعمیر کے بعد پنجابی آباد کاروں کو نئی زمین آباد کرنے لایا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ سندھ کے جاگیرداروں نے انگریز پر واضح کیا کہ وہاں کے ہاری (کاشتکار) نئی زمین تیار کرنے کے اہل نہیں۔ سکھر بیراج

اس طرح دانستہ یا نادانستہ طور پر پنجاب کے افسر اور وہ افسر جنہوں نے ہندوستان کی بجائے پاکستان کا انتخاب کیا تھا مل کر شبہات کے ایسے بیج بوئے اور مقامیوں میں ایسی بے چینی اور

اضطراب پیدا کیا جس نے پاکستان کو ایک تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا ہے۔

سندھ جو صوبہ بمبئی کا حصہ تھا۔ ہندو تاجروں کے لئے ایک جائے امن تھا۔ وہ لوگ سندھ کے کاہل جاگیردار اور ان کے منیجروں کا مالی ضمیر بن گئے تھے۔ وہ ان لوگوں کو قرضہ دیتے۔ پھر ان کی زمینوں کو ہتھیا لیتے، ان کے ذہنوں پر کنٹرول رکھتے اور ہاری کے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کرتے جو انگلستان کے ابتدائی دور میں وہاں کے غلام نما صرف کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا۔ سندھ کے ہاری کو انسان کی بجائے بکاؤ سامان تصور کیا جاتا۔ جاگیردار انہیں نہ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دیتا نہ ملٹری میں سروس کرنے کی۔ مبادا یہ لوگ سمجھدار بن کر اور ان کا ذاتی مفاد زمین سے منسلک مختار نہ ہو جائیں۔ یہ لوگ خود بھی اتنے ست اور کاہل تھے کہ فوج میں جانے کو تیار نہ تھے۔ جاگیرداروں نے پنجاب آرمی پر الزام لگایا کہ وہ سندھ کی نئی نہری زمینوں کو آباد کرنے کیوں آ گئے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ فوج کو وہاں پر حکومت پاکستان نے آباد کیا ہے تاکہ سندھ میں افسروں کے ناجائز مفادات کو سہارا دیا جا سکے۔ انگریزوں نے تو ریٹائرڈ وائسرائے کمشنڈ افسروں (صوبیدار اور جمعدار) کو ان کی گراں قدر خدمات کے صلے میں ایک مرتبہ (۲۵ ایکڑ؟) زمین انعام کے طور پر عطا کی تھیں اس کے برعکس آمر ایوب خان نے اپنے خود غرضانہ مفادات کی خاطر حاضر سروس جرنیل تک کے عہدوں کے حامل افسران کو سندھ میں نئی نہری زمینیں عطا کی تھیں۔

اگرچہ لسانی اور نسلی اعتبار سے بنگالی، سندھی، بلوچ اور پٹھان مختلف تھے لیکن سندھ میں بلوچی، مکرانی، پرانے آباد کار پنجابی، پٹھان اور مقامی سب مل جل گئے تھے۔ بلوچستان کی آبادی میں بلوچ، پٹھان، بروہی جو یہاں کے اصل باشندے ہیں اور ہزارہ قبائل پر مشتمل ہے جو جنگلوں میں آباد تھے اور افغانستان کے اصل باشندے ہیں اور علاوہ اس کے پنجاب اور سرحد کے در آمد شدہ سرکاری ملازمین بھی ہیں۔

برصغیر میں ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو اس کی مسلم آبادی دس کروڑ سے اوپر تھی۔ مشرقی پاکستان میں ہندو ساہوکار جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا زمینوں کا مالک بن گیا اور مقامی مسلمان جو سابق مالکان تھے ان کو ایک کی سے بھی نچلے درجے تک پہنچا دیا گیا۔ بعض مقامات پر یہ رسم رائج تھی کہ ہندو جاگیردار کسی مسلمان کیرے کے گھر پیدا ہونے والے بچے کو اپنے جوتے کی نوک سے چھوتا اور پھر اس کا نام رکھتا۔ ڈھاکہ کے مسلم جولاہے کے ہاتھ اس لئے کاٹ دیئے گئے تاکہ مانچسٹر اور لنکا شائر کی ملوں کو تحفظ دیا جا سکے۔ دنیا بھر میں نیل (Indigo) کی اجارہ داری رکھنے والے وطن عزیز کا کاشتکار اس متبادل کیمیکل کا شکار ہو گیا جو برطانوی کارخانہ دار نے تیار کیا

تھا۔ بنگال میں قائم شدہ صنعت کی ملکیت انگریزوں کے پاس تھی یا پھر ہندوؤں کے پاس۔

مغربی پاکستان میں مالکان زمین کا خون ہندو ساہو کاروں نے چوس چوس کر انہیں مریل بنا دیا تھا۔ مسلمان کو نہ صرف صنعتوں سے دور رکھا بلکہ انہیں فیکٹریوں میں ملازمت بھی نہ دی گئی۔ وہ صرف کرائے کی فوج کے لئے بھرتی کی ایک بنیاد تھے یا سول سروس میں چھوٹے اہلکار یا وہ گھریلو نوکر تھے یا اس قسم کے دوسرے کاموں کے لئے ایک سستی لیبر تھے۔ مسلمانوں کی ملکیت میں چند ایک چھوٹی صنعتیں تھیں۔ پورے پنجاب میں صرف پانچ عدد فلور ملیں اور کچھ جننگ فیکٹریاں جو شیخ محمد اسماعیل کی ملکیت تھیں۔ ایک چائے کا چھوٹا سا کارخانہ پالم پور کانگڑ میں جو میرے خاندان کی ملکیت تھا۔ منڈی بہاؤالدین میں زرعی اجناس کا صرف ایک آڑھتی پورے پنجاب کی منڈیوں میں تھا۔ پوری انارکلی میں مسلمانوں کی صرف تین دکانیں تھیں کرنال بوٹ ہاؤس، بمبئی کلاتھ ہاؤس اور شیخ عنایت اللہ کی دکان۔ مال روڈ پر چیف بوٹ ہاؤس مسلمانوں کی اکلوتی دکان تھی۔ صرف دو چھاپہ خانے مسلمانوں کی ملکیت تھے ایک پیسہ اخبار والوں کا اور دوسرا فیروز سنز کا۔ مال روڈ پر ایم حیات کی فرنیچر کی ایک دکان پورے لاہور میں تھی۔

اپنے برطانوی آقاؤں کی پسند و ناپسند کی وجہ سے مسلمانوں کو بے پناہ رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ نتیجے کے طور پر انہوں نے ایک کرم خوردہ ملک پاکستان حاصل کر لیا۔ مخالفین کا خیال تھا کہ یہ چھ ماہ کے اندر اندر ختم ہو جائے گا۔ ادھر ۱۹۴۷ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی جلد بازی کا نتیجہ مسلمانوں کے خوفناک قتل عام کی صورت میں نکلا۔

انگریزوں نے جاتے وقت آزادی کے لئے لڑنے والوں کی بجائے اپنے تربیت کردہ پاکستانی سول اور فوجی ملازمین کو اعتماد میں لیا۔ ان میں سے بعض ان کے ایجنٹ اور مخبر بن گئے انگریز اپنے سابق پولیس افسروں مسٹر احمد جیسے لوگوں کی وفاداری پر زیادہ اعتماد کرتے تھے۔ اس کے نام لکھا گیا خط جو ہمارے قابو میں آگیا۔ یہ اس کھیل کا آغاز تھا جس کے تحت سیاستدانوں کی جڑیں غیر محسوس طریقے سے کاٹنا شروع کر دی گئیں۔ سیاسی حکومتوں کو میوزیکل چیرز کی طرح کھلونا بنایا گیا اور انجام کار سول اور ملٹری تفوق کو قائم کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ گزشتہ سینتالیس سالوں میں صرف تقریباً ۸ سال اور وہ بھی پانچ پانچ دس دس سالوں کے وقفے کے بعد سیاستدانوں کو پاکستان میں حکومت کرنے کا موقع ملا۔ سروسز کے ان لوگوں نے اپنے آپ کو ان لوگوں سے برتر اور اعلیٰ سمجھنا شروع کر دیا جنہوں نے پاکستان کے حصول کے لئے جنگ لڑی اور جو ملک کے اصل بانیوں میں تھے۔

سروسز نے اپنے تفوق کو قائم کرنے کی کوشش میں ملک توڑ دیا۔ مشرقی پاکستان کو الگ

ہونے پر مجبور کیا۔ جن لوگوں نے انتخابات میں واضح اکثریت حاصل کی تھی انہیں حکومت کرنے سے محروم رکھا گیا۔ بنگالیوں نے محسوس کیا کہ انگریز نو آباد کار مالکوں کا بس تبادلہ ہوا ہے اور اس تبادلے میں انہیں ایک بدترین قسم کے سول اور ملٹری آباد کار ملے ہیں جن کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا۔

جس وقت پاکستان نے آزادی حاصل کی اس وقت انگریز مختلف مقامات سے اپنا بوریا بستر لپیٹنے لگے۔ جلد ہی انہیں سویز پار پالیسی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ زیادہ سے زیادہ تنگ نظر ہوتے چلے گئے۔ ان کی حکومت اور خارجہ پالیسی کا انحصار امریکہ پر ہونے لگا۔ روسی اور امریکی دنیا کی سربراہی کے لئے آپس میں مقابلے پر اتر آئے۔ جنگ عظیم کو جیتنے والا برطانیہ اپنی معاشی برتری جنگ میں ہارنے والوں کے ہاتھ کھو بیٹھا۔ فتح کے بعد مفتوح ممالک پر پابندیاں لگا دیں کہ وہ جدید اسلحہ تیار نہیں کریں گے۔ اس غیر دانشمندانہ پابندی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان ممالک نے اپنے دفاعی اخراجات کم کر کے اپنی صنعتوں کو جدید سے جدید تر بنایا۔ یہ ایک بلاواسطہ معاشی سہارا تھا جو فاتح نے مفتوح کو پہنچایا۔

میں ادب کے ساتھ گزارش کروں گا کہ ہر ملک کے مسائل کا پائیدار حل صرف سچی جمہوریت میں پنہاں ہے۔ اسی جمہوریت میں ہی توقع رکھی جا سکتی ہے کہ عوام کی بہتری اور بہبودی ہو۔ اگر زردار طبقہ تھوڑی سی قربانی، تھوڑی سی بے غرضی، تھوڑی سے عالی ظرفی دکھائے تو اس کا نتیجہ جمہور کو مضبوط اور خوشحال بنا سکتا ہے اور بڑی طاقتوں کے خود غرضانہ منصوبے جو اینگلو امریکن بلاک گیٹ (GATT) کے ذریعے دنیا بھر کو اپنی مرضی سے چلانا چاہتا ہے زرداروں کی قربانی اس کا مداوا بن سکتی ہے۔ مجھ پہ خیالوں میں گرفتار (Utopian) کی پھبتی بے شک کسی جائے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ انسان کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ سچی جمہوریت کی تمنا میں بے شک مر جائے بجائے اس کے کہ وہ کسی آمر کی سرپرستی میں زندہ رہے جسے مشرقی کیمونسٹ لایا ہو یا مغربی سرمایہ دار۔

سوویت یونین جسے انگریزوں نے افغانستان کو بفر ریاست بنا کر ایک صدی تک دریائے آکسس کی کھاڑی تک محدود رکھا تھا اینگلو امریکن بلاک کی عدم دلچسپی اور پاکستان کی ابتر حالت جو غیر نمائندہ حکومتوں نے پیدا کر رکھی تھی کو دیکھتے ہوئے اس نے فائدہ اٹھایا اور افغانستان میں گھس آیا۔

اس حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے امریکنوں نے ایک آمر سے چشم پوشی کے ساتھ افغانستان اور پاکستان کے بنیاد پرستوں کو اپنا آلہ کار بنایا۔ امریکہ نے ہمیں ایک رضامند آلہ کار سمجھ کر اس

مہم میں داخل کر دیا۔ ہم نے احمقانہ انداز میں مہاجرین کے غیر منظم جم غفیر کو پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک داخل ہونے کی اجازت دے دی۔ جن کی تعداد اب تیس لاکھ ہو چکی ہے۔

سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد یہ مہاجرین ہمارے لئے ایک مستقبل بوجھ بن چکے ہیں۔ اب امریکنوں کو اپنے قدیم آلہ کار کی کوئی ضرورت ہے نہ اس سے کوئی دلچسپی۔ انہوں نے امداد بھی بند کر دی اور افغانوں کی واپسی میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بہت سے افغان رہنما اب ایک دوسرے کے ساتھ جنگ میں کابل اور دوسرے مقامات کو تباہ کرنے میں الجھے ہوئے ہیں۔

پاکستان کی یہ اجازت کہ وہ ہمارے ملک کو جائے امن اور ساتھ ہی ساتھ انتہائی جدید اسلحہ کا بیس کیمپ بنا کر امریکہ کی جنگ میں حصہ لیں پاکستان کے لئے ایک خوفناک آفت ثابت ہوئی۔ اس اجازت کی بنا پر رشوت، حرص اور منشیات کے سیلابی بند دروازے کھل گئے۔ جس کے نتیجے میں بہت سی بیماریوں نے جنم لیا۔ اخلاقی قدریں تباہ ہوئیں، لاکھوں عورتیں اور مرد منشیات کے عادی بن گئے۔ منشیات کا سرمایہ سیاست میں زہر پھیلانے لگا۔ اسمگلر اسمبلیوں میں جا پہنچے۔ راتوں رات امیر بننے کی ریٹ ریس شروع ہو گئی۔ اسمگلروں نے اسمبلیوں میں اور معاشرے میں بہت سی برائیوں کو جنم دیا۔ جیسے اختیارات کی خریداری، دولت کے بل بوتے پر ممبران اسمبلی کی خریداری، ممبر کی بولی کا ایک کروڑ تک چلا جانا، منشیات کے عادی افراد کا ڈکیتیاں کرنا، اجتماعی آبروریزیاں اغوا برائے تاوان اور مہلک امریکی ہتھیاروں کی خرد برد وغیرہ۔ یہ وہ برائیاں ہیں جن میں پاکستان دھنس چکا ہے۔ ممبران اسمبلی کے خلاف بھی بہت سی انگلیاں اٹھ رہی ہیں۔ لا اینڈ آرڈر ختم ہو چکا ہے۔ افغان جنگ کے دوران جرنیلوں کا غیر قانونی طور پر ہتھیاروں کی دوسرے ممالک کو فروخت اور اس کے نتیجے میں راولپنڈی میں واقعہ اسلحہ کے ذخیرے کو بم سے اڑا کر بہت سی جانوں اور املاک کی بربادی ان برائیوں میں سے چند ایک ہیں۔ معمولی اکثریت کی حامل حکومت ملک میں نظم و نسق برقرار رکھنے میں بے بس نظر آ رہی ہے۔

مشرقی پاکستان کی اکثریت کو دور پھینک دینے کے بعد اب باقی ماندہ پاکستان بھی کھچاؤ کا شکار ہے۔ چھوٹے صوبے پنجاب کو جس کی آبادی باقی تینوں کی مجموعی آبادی کے برابر ہے اپنے لئے عذاب جان سمجھتے ہیں۔ صوبائیت اور مقامیت کے مفادات کی خاطر غیر پنجابی پنجابیوں کو دشمن سمجھنے لگا ہے۔ بلوچستان میں علیحدگی کی تحریک کی اب کھلے بندوں تبلیغ ہو رہی ہے۔ دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ اسی فیصد پنجابی فوج ملکی بجٹ اور دولت کا بڑا حصہ کھاتے ہوئے چھوٹے صوبوں کو اپنے جائز

حق سے محروم کر رہی ہے۔

اس تمام تر بحث کا ایک ہی جواب ہے اور وہ ہے ایک "سچی جمہوری حکومت"۔ آج کے دور میں کسی طاقتور آدمی کی حکومت کی ضرورت نہیں ہے۔ پنجاب کو وہ لوگ جن کا خیال ہے کہ پنجاب آرمی ان کے حصے کے وسائل کو ناجائز طور پر کھا رہی ہے اپنے انتقام کی آگ میں اسے تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ ایوب خان کی ایک بڑی فوج لوگوں کو خوفزدہ نہ کر سکی۔ اس کے جانشین یحیٰی کی فوج جسے اس نے اپنے ہی غیر مطمئن اور مایوس لوگوں پر مشرقی پاکستان میں استعمال کیا جس کے نتیجے میں ملک دو ٹکڑے ہو گیا۔ مشرقی پاکستان کے سانحے سے کسی نے سبق سیکھا نہ انگریزوں کی اس بے بسی سے جو برصغیر کے نہتے عوام کے ہاتھوں مجبور محض ہو کر رہ گئے تھے۔

فوج بلوچوں کو دبانے میں ناکام رہی۔ وہ وقت یاد کریں جب ان کے لیڈر، ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھوں حکومت سے نکال کر جیلوں میں ڈال دیئے گئے۔ تین سالوں تک خونریزی جاری رہی۔ آخر کار فوج کو واپس بلانا پڑا۔

اور آخر میں بنیاد پرستی کا وہ نظریہ جس کا سرپرست سعودی عربیہ ہے اور وہ نظریہ جو خمینی ازم کہلاتا ہے پاکستان کے بہتر تعلیم یافتہ لوگوں میں پھل پھول نہیں سکتا۔ لوگوں کی اب اس دلیل سے تسلی نہیں ہوتی کہ انہیں اگلے جہان بہت کچھ ملے گا۔ ضیا نے اسی بنیاد پر حکومت کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا انجام جہاز کے ایک خوفناک دھماکے کی صورت میں برآمد ہوا۔

ہمارے مسائل بنیادی طور پر معاشی ہیں نہ کہ مذہبی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہمارا مذہب اسلام ہے۔ لیکن قائداعظم نے پاکستان کے لئے تھیوکریسی کا انتخاب نہیں کیا تھا۔

کسی سختی کی بنا پر مذہب لوگوں کے دلوں میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔ کسی پارسا کے پند و نصائح بھوکے لوگوں کے پیٹ نہیں بھر سکتے۔ ان نصیحتوں کی بنا پر ہم قانون کی حکمرانی، اپنے عزیزوں کی بے جا پاسداری، رشوت اور بد دیانتی جو اب ایک وبائی صورت اختیار کر چکی ہے لوگوں کو جو اصل ضرورت ہے وہ ہے پیٹ بھر کھانا، محفوظ گھر، صحت اور بچوں کی تعلیم اور امن کے ساتھ گزر بسر۔ کوئی بھی ان باتوں کی طرف دھیان دیتا نظر نہیں آتا۔ سب اقتدار کے حصول اور اس کے ناجائز استعمال کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ہمیں ہمارے ملک کو معاملے کے نشیب و فراز پر ہر پہلو سے غور کرنا چاہئے۔

گم گشتہ قوم

(ایک مجاہد آزادی کی یادداشتیں)

سردار شوکت حیات خان

جنگ پبلشرز

